# ۲۶

کوئی ہفتہ دس دن بعد کی بات ہے' میری بیوی نے ڈرائنگ روم کی صفائی کرواتے ہوئے صوفوں کی گدیوں کو اتار کر بید سے جھاڑا تو اس صوفے کی گدی تلے سے کچھ کاغذ نکلے جو خاکی لفافوں کو کاٹ کر تحریر کے لیے استعمال کئے تھے۔ ان میں کچھ سفید اور پیلی پٹیاں بھی تھیں لیکن زیادہ تعداد خاکی کاغذوں کی تھی جو مختلف سائز اور مختلف کٹاؤ کے تھے۔

میری بیوی نے ان کاغذوں کو دیکھا۔ عبارت کو غور سے پڑھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دفتر سے واپسی پر اس نے وہ کاغذ میرے حوالے کرتے ہوئے طنزاً کہا "یہ آپ کے گورودیو کے کاغذات معلوم ہوتے ہیں۔ مٹھائی انہوں نے نکال کر کھالی اور لفافوں کو کاٹ کر تھدے پیڈ بنالئے۔

وہ مڑے مڑے لپٹے لپٹائے اور اور گچھا مچھا قسم کے کاغذ انہی کے تھے اور ان پر انہی کی لکھائی میں مختلف النوع عبارتیں درج تھیں۔ کچھ راگوں کے مکھڑے تھے۔ کچھ بندشیں تھیں۔ کچھ شدھ راگوں میں بندھے ہوئے بھجن تھے لیکن زیادہ لمبی اور پیچیدہ عبارتیں نثر میں تھیں جو یوں شاید ان کے بھاشنوں میں مدد کے لیے مختلف حوالوں سے اچکی گئی تھیں۔ کہیں کہیں یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے لیے لکھی گئی تھیں اور انہیں سبقاً سبقاً میرے پڑھانے کے لیے محفوظ کیا گیا تھا۔ بہت سے سوال ایسے تھے جو میں نے ان سے پوچھے تھے لیکن انہوں نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کچھ نوٹس ان کے اپنے لئے بھی تھے جو ابھی تشکیک کے مراحل میں تھے۔

میں نے ان کاغذوں کو سیدھا کیا۔ ان کی پشت پر پانی کے ہلکے ہلکے تریڑے دے کر انہیں سیدھا کیا اور پھر ایک نئی فائل میں ٹھونس کر کے دفتر لے گیا۔

ایک کاغذ پر لکھا تھا:

WWW.PAKSOCIETY.COM

انہد شبد دس طرح کے ہیں۔ ان کا باجہ اپنے اپنے رنگ کا ہے۔ کوئی انہد باجہ شاہانہ ہوتا ہے کوئی فقیرانہ۔ پہلا شبد چن شبد ہے۔ دوسرا چن چن جھنگا شبد۔ تیسرا گھنٹے کی آواز۔ چوتھا سنکھ کی آواز۔ پانچواں بین کی آواز۔ چھٹا تال کی آواز۔ ساتواں بانسری کی آواز۔ آٹھواں مردنگ کی آواز۔ نواں نفیری کی آواز۔ دسواں بادل کی سی گرج۔

پہلا شبد سننے سے سب روم بدن کے اٹھ جاتے ہیں۔ دوسرا سنے تن میں آلکس چھپا دے۔ تیسرا سنے پریم کی زیادتی ہو۔ چوتھا سنے مغز میں سے خوشبو آئے۔ پانچواں سنے ایمن اترنے لگے۔ چھٹا سنے گلے کے نیچے ایمن آودے۔ ساتواں سنے انتر جامی ہوئے۔ آٹھواں سنے تو باہر بھیتر سا سن پڑے۔ نواں سنے تو گیدھ ہونے کی سامرتھ ہو جائے۔ دسواں سنے سب باسنا چھٹے ہو جائے ساری خواہش' طلب' تنگ و دو ختم ہو جائے۔ پربرہم ہو جائے گا۔ فارسی میں ناد کی اپاسنا کو سلطان الاذکار کہتے ہیں۔ چشم بند و گوش بند و لب بہ بند گر نہ یابی سر حق بر من بجند۔ گورونانک دیوجی فرماتے ہیں میں تین بند لگائے کے انہد سنے نکور+ نانک سن ساوھ میں نہیں سانجھ نہیں بھور حسب دیگر دھیانوں کے یعنی تصور ذکر اتہ۔ ذکر قمری وغیرہ سے سلطان الاذکار افضل ہے۔

سن پڑے ہے انہد کا باجا + پر جاسے ہووے جیسے راجا

سب ہی ساز تن میں بجیں مچا ہے کیسا راگ + وجھن جا کو سن پڑن بڑے ہیں وا کے بھاگ

پہلے کاغذ کی پٹی پر لکھا تھا: تو کچھ نہیں ہے۔ اپنی خودی کو دور کر۔ کرتب یہ ہے کہ ایسا جاننا کہ سوائے خدا کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ سوائے میرے اور کچھ نہیں ہے۔ سب میں ہی ہوں اور جتن اپنے اختیار میں اور اصل جتن یہ ہے کہ خودی کو دور کرے اور دوئی سے تنگ ہٹ جائے۔ مسجد تیار کرانا کام بادشاہوں کا ہے۔ روزہ رکھنا اور ذکات دینا اور نماز پڑھنا کام گنہ گاروں کا ہے۔ حج کرنا کام مسافروں کا ہے۔ روٹی کھلانا کام دردمندوں کا ہے۔ پرہیز کرنا کام بیماروں کا ہے۔ غسل کرنا کام ناپاکوں کا اور عبادت کرنا کام امیدواروں کا ہے۔ گوشہ میں رہنا کام قیدی کا ہے۔ خوف اور رجا میں رہنا کام لڑکوں کا ہے۔ عاشق ہونا کام عیاشوں کا ہے۔ خدمت کرنا کام سعادتمندوں کا ہے اور بے خود ہونا کام مردوں کا ہے۔..... اصل میں پیدا کرنے والا اور پیدائش سب ایک ہے جیسے جب تک دوات میں روشنائی ہے سیاہی کہلاتی ہے' وہی جب کاغذ پر لکھنے میں آئی تو طرح طرح کی تحریر میں آئی۔ اب اس کو کوئی سیاہی نہیں کہتا بلکہ تحریر کہہ کر پکارتا ہے۔ مگر اصل میں جو تحریر ہے وہ

OCIETY.COM

سب سیاہی ہے۔ بس اس طرح کل ایک ہی شے ہے۔ پیدا کرنے والا وہی ہے اور پیدائش بھی وہی ہے۔ مایا یعنی قدرت بھی وہی ہے۔ کامل و ناقص بھی وہی ہے......

خاکی لفافے کے دوسری طرف لکھا تھا...... دنیا اتم کہانی ہے کوئی بید شاستر کی مہما کرتا ہے کوئی نندا کرتا ہے۔ کوئی بدیا کی مہما کرتا ہے کوئی خلاف اس کے بولتا ہے۔ کوئی سادھ گرو کی سیوا کو مکھ گاتا ہے کوئی کرم اپاسنا۔ گیان دھیان 'جوگ 'جپ 'تپ پوجا' تیر تھ برت سب ہی کو اچھا کر دیتا ہے۔ پر مارتھی لوگ دھن کی نندا کرتے ہیں۔ دنیادار دھن کو بڑا کہتے ہیں۔ کوئی نیک نامی کو بہت اچھا کہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے نیک نامی بھی جگت کے لیے ہے...... کوئی کہتا ہے ایکانت رہنا اچھا ہے کوئی کہتا ہے درس پرس اور ملنا ملانا اچھا ہے۔ غرضیکہ ان نوں کو ایسے ایسے سندیہہ اور چنتا اکثر ستاتے ہیں بلکہ ست سنگ اور پرمارتھ سے ابھاد کرا دیتے ہیں۔ اگر انسان کہن کے بھید اور اپنے ادھکاوے واقف ہووے اور پچھ پات کو چھوڑ دیوے تو ایک سندیہہ بھی پاس نہ پھٹکے اور سب اچھے دیکھیں......

ایک شخص کے چار لڑکے ہیں۔ چاروں کی عمر 'عقل 'ذہن 'اچ' چلن اور بدن میں ایک دوسرے سے فرق ہے اور باپ کا مطلب یہ ہے کہ چاروں روزگار کریں۔ گھر سنبھالیں۔ نیک چلن ہوویں 'خوش رہیں اور دوسروں کو خوش رکھیں۔

اب اگر باپ ایک ہی سیکھ اور ایک سی تعلیم سب کو دیتا ہے تو کام نہیں چلتا۔ کس واسطے کہ عمر اور عقل وغیرہ میں سب کے فرق ہے۔ اب اس کو ضرور ہوا کہ حسب استعداد و لیاقت فی زمانہ ہر کو علیحدہ علیحدہ سیکھ دیوے۔

سب سے بڑا لڑکا لکھا پڑھا ہے۔ ہوشیار ہے۔ عمر پچیس تیس برس کی رکھتا ہے۔ تندرست ہے۔ بیاہ شادی ہو گیا ہے۔ اس کو اب باپ سیکھ نوکری کرنے کی دیتا ہے اور نوکری کے قاعدوں اور فائدوں کو سمجھاتا ہے۔ اگر وہ لڑکا تعریف اور سکھ سوداگری اور زمینداری وغیرہ کے بیان کرتا ہے تو باپ اس کا ہزاروں عیب اور نقصان ان میں دکھاتا ہے اور نوکری کو سب طرح سے مفید کہتا ہے کہ دیکھو نوکری میں عزت بڑی ہے۔ سو روپے کے متعدی کی عزت لکھ پتی سے زیادہ ہوتی ہے۔ دو تین پہر نوکری کی پھر چھٹی ہے۔ معزز لوگوں کی صحبت میسر آتی ہے۔ علم و عقل کی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ حکومت ہوتی ہے۔ نام روشن ہوتا ہے۔ ہزاروں کی کاربراری ہوتی ہے۔ بڑی رجوعات رہتی ہیں۔ اور سوداگری وغیرہ کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ بس پیٹ بھر لینا ہے۔ نہ علم میسر آتا ہے نہ چنداں عزت ہوتی ہے۔ گھر گھر پھرنا

WWW.PAKS

پڑتا ہے۔ اسامی ڈوب جاتی ہے۔ دن رات فکر لینے دینے کی رہتی ہے۔ جھوٹ بہت بولنا پڑتا ہے..... کیونکہ لڑکا لکھنے پڑھنے میں رہا تھا اس کو حسب فہمائش باپ کے نوکری ہی آسان اور مفید معلوم ہوئی۔ تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ نوکری پائی اور اس کا مطلب پورا ہو گیا۔

دوسرا لڑکا بیس برس کی عمر رکھتا ہے۔ کچھ تھوڑا ہی پڑھا ہے ذہن بھی اچھا نہیں ہے۔ تندرستی میں بھی فرق رہتا ہے۔ گفتگو میں بھی ربط واجبی ہے۔ اس لیے لڑکے کو باپ واسطے سوداگری اور دکانداری کے ہدایت کرتا ہے۔ اگر لڑکا نوکری کرنے کو کہتا ہے تو باپ نوکری میں ہزاروں عیب نکال کر کہتا ہے بھائی نوکری غلامی ہے۔ ہر وقت حاکم کا خوف رہتا ہے۔ دیس گھر چھوٹ جاتا ہے۔ بیگانوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ کل فکر اپنے ذمہ ہوتی ہے اور گنی کوڑیاں ملتی ہیں۔ نوکری میں سکھ نہیں..... اور سوداگری میں یہ سب باتیں میسر آتی ہیں۔ گھر کی بادشاہت ہے نہ کسی کا حکم سہنا پڑتا ہے نہ کسی کی فرمائش سنی پڑتی ہے۔ روٹی کری کرائی ہاتھ آتی ہے۔ رات کو گھر میں سونا ملتا ہے۔ سینکڑوں آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ وقت پر قابو ہوتا ہے۔ جب چاہا کام کیا جب نہ چاہا نہ کیا۔ کچھ بہت سا علم اور گیان بھی نہیں چاہئے۔ اور ایسے پیشے والے دیکھ لو کیسے خوش ہیں۔ بڑے بڑے مکان تیار کراتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں کی دولت ہے۔ کسی کی پرواہ نہیں رکھتے۔ لڑکے نے اپنا حال دیکھ کر اور باپ کی نصیحت سن کر نوکری سے ہاتھ اٹھایا اور سوداگری کرنے لگا۔

تیسرے لڑکے کی عمر بارہ برس کی ہے۔ اس کو باپ واسطے تحصیل علم کے تاکید کرتا ہے اور فوائد علم کے سنا کر کہتا ہے کہ جو کھیل میں رہتے ہیں بدمعاش ہو جاتے ہیں۔ روٹی کھانے کو نہیں ملتی۔ دربدر دھکے کھاتے ہیں۔ باپ اس کو مکتب جانے کو رغبت دیتا ہے۔ کبھی کبھی بوقت ضرورت خوف دلا کر کہتا ہے کہ گھر سے نکال دوں گا۔ تجھ کو کھانے کو نہیں دوں گا۔ تمام رات کوٹھڑی میں بند رکھوں گا۔ اگر کہنے سے نہیں مانتا تو مارتا بھی ہے اور کسی موقع پر دم دلاسہ بھی دینے لگتا ہے۔ پیار کرتا ہے۔ خود کھیل بھی کھلاتا ہے۔ اگر لڑکا گھر سے باہر جانے میں ڈرتا ہے تو اس کی ہمت بندھاتا ہے اور کہتا ہے کہ بدون باہر جانے کے علم کیسے آوے گا۔ اور گھر کے رہنے میں لڑکے خراب بھی ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لڑکے تیرا نام ڈرپوکنار کھ دیں گے..... دیکھو باہر جانے میں بڑی سیریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ تجھ سے بھی چھوٹے لڑکے دن رات باہر پھرا کرتے ہیں اور مطلق نہیں ڈرتے..... اب دیکھ لیجئے کہ لڑکے سے کچھ فائدہ یا نقصان نوکری اور سوداگری کا نہیں بیان کرتا۔ جس سے مطلب ہے

OCIETY.COM

اس کی تعریف بدرجہ اتم کرتا ہے۔

اب چوتھا لڑکا پانچ برس کی عمر کا ہے۔ اس کے لیے باپ کھیل کا سامان بناتا ہے۔ کھلونے خرید کر لاتا ہے۔ اسے کھلاتا ہے۔ اس سے ہنسا کرتا ہے۔ اس کی بے وقوفیوں کو ناز سمجھتا ہے۔ اس سے دن رات جھوٹی جھوٹی باتیں کرتا رہتا ہے۔ جھوٹے اقرار کرتا ہے۔ طرح طرح کی کہانیاں سناتا ہے۔ اگر لڑکا باہر نکلتا ہے تو اس کو باہر جانے کو منع کرتا ہے اور کہتا ہے باہر جانا اچھا نہیں ہوتا۔ چور پکڑ کر لے جائے گا۔ جو کوئی چاہے گا' تجھے مار ڈالے گا۔ گھر سے باہر کبھی مت جانا۔ باہر پاؤں رکھنا بہت بُرا ہے۔ اب لڑکا بباعث خوف و خطر گھر سے باہر نہیں جاتا۔ گھر میں کھیلتا ہے۔ لڑکے کو بھی اچھا اور باپ بھی راضی۔ اس لڑکے سے لکھنے پڑھنے کو نہیں کہتا۔ علم اور نوکری اور سوداگری کے فائدے نہیں سناتا۔

دیکھو اب اس شخص نے علیحدہ علیحدہ نصیحتیں چاروں لڑکوں کو کیں اور بالکل الگ الگ کیں۔ بعض جگہ اچھی بات کو بُرا کہا اور بعض جگہ بُری بات کو اچھا۔ مگر کوئی اس شخص کو جھوٹا نہیں کہے گا۔ نہ غلط کہے گا بلکہ عقلمند سمجھ والا کہے گا..... اس کے آگے کاغذ چکنا تھا شاید مٹھائی کا لفافہ تھا جس کی وجہ سے لکھائی پڑھی نہیں جاتی تھی۔ ساری عبارت چکنائی میں اتر چکی تھی۔

ایک کھدری سے کاغذ پر گورمکھی سی میں کچھ لکھا تھا جو تحریر کے انداز سے نظم دکھائی دیتا تھا۔ اس میں جگہ جگہ الفاظ کاٹے ہوئے تھے اور ان کی جگہ دوسرے الفاظ لکھے گئے تھے۔ کونوں میں فارسی کے باریک رسم الخط کے شعر تھے جو اپنی پیچیدگی کی وجہ سے ٹھیک سے پڑھے نہیں جاتے تھے۔

اسی کھدری کاغذ کی دوسری طرف اردو میں تبدیلی مذہب پر ایک پیراورج تھا۔ جو شخص تبدلی مذہب کر ڈالتے ہیں اس کی یہ صورت ہے کہ حضرت کو اپنے باپ دادے کی جمع پونجی تو معلوم نہیں ہوتی کہ کتنے کروڑ خزانے رکھے ہیں اور دوسری طرف سے یقین کر کے کہ یہ بڑا جج والا ہے جھٹ اپنے مالک کو چھوڑ کر دوسرا مالک کر لیتے ہیں۔ یہ دستور ہے کہ جب ایک مذہب والا دوسرے مذہب کی نندا کرتا ہے تو جو باتیں اس میں چھوٹے چھوٹے متبدیوں کے لیے کہی ہیں ان کو سنا کر اپنے یہاں کی بلند سے بلند باتوں سے مقابلہ کر کے پھسلا لیتے ہیں۔ اپنے گھر کی تو رسوئی کا ذکر کرتے ہیں اور دوسرے کے گھر کے بیت الخلا کا نقشہ دکھلاتے ہیں۔ پس بھوکا روٹی کے لالچ میں پھنس جاتا ہے۔ مگر چونکہ تعصب مذہب بھی درست ہے پس جس نے تبدیل مذہب کرایا کچھ گناہ نہیں کیا' اور جس نے مذہب بدلا اس کو بھی گناہی

نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس مذہب کے بموجب معرفت میں داخل کیا۔ ہاں اتنی بات ہے کہ اپنے گھر کی اچھوتی روٹی چھوڑ کر دوسرے کے گھر کو جوٹھن جا کھائی۔

اس کاغذ کی دوسری طرف لکھا تھا: جسم وزبان اور عقل وحواس اور دل کو قابو میں رکھ کر ہاتھ جوڑے ہوئے گورو کو دیکھتا ہوا سامنے کھڑا رہے۔ گورو کے سامنے ایسا طریقہ اختیار کرے کہ جیسا گورو بھوجن کرے اس سے ادنیٰ درجہ کا بھوجن آپ کرے اور جیسا کپڑا گورو پہنے اس سے کم درجہ کا کپڑا آپ پہنے۔ جیسی صورت سے گورو رہے اس سے کمتر صورت میں آپ رہے۔ گورو بیٹھے ہوں تو آپ کھڑا ہو کر اور گورو کھڑے ہوں تو آپ چل کر اور گورو چلتے ہوں تو آپ سامنے جا کر اور اگر گورو دوڑتے ہوں تو آپ بھی پیچھے دوڑ کر گفت وشنید کرے۔ گورو کے پاس شیشہ کا بستر اور آسن نیچے ہونے چاہئیں۔ گورو کے سامنے حسب من پسند ہاتھ پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھے۔ جہاں گورو کا سچا یا جھوٹا عیب کہا جاتا ہو وہاں سے اٹھ جائے یا اپنے کان بند کر لے کیونکہ گرو کا سچا یا جھوٹا عیب کہنے سے گدھا اور نندا کرنے سے کتا ہوتا ہے' اور گورو کی بڑائی نہ سہہ سکنے سے بڑا کیڑا ہوتا ہے۔ اشنان کرانا' ابٹن لگانا' جوٹھا کھانا اور پاؤں دھونا یہ سب کام گورو کے بیٹے کے نہ کرے صرف گوروہی کے کرے۔ جو برہم چاری شریر تیاگ کرنے تک گورو کی سیوا کرتا ہے وہ بلا محنت ابناشی برہم لوک کو پاتا ہے۔

انگرا کے بیٹے نے اپنے چچا کو وید پڑھایا اور بیٹا کہا۔ وہ چچا خفا ہو کر دیوتاؤں سے پوچھنے گیا۔ دیوتاؤں نے جواب دیا کہ اس لڑکے نے ٹھیک کہا کیونکہ جو کچھ نہیں جانتا وہ بالک کہلاتا ہے اور جو منتر دیتا ہے وہ باپ کہلاتا ہے۔

ہلکے نیلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی پرچیاں تھیں لیکن ان پر گورمکھی میں عبارت لکھی تھی۔ میں نے یہ سارے کاغذ سنبھال کر اور سینت کر پلاسٹک کے ایک لفافے میں رکھ لئے۔

بڑی دیر تک میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ انہوں نے یہ کاغذ میرے لیے چھوڑے ہیں یا ان کے اپنے نوٹس ہیں جو وہ بھول گئے ہیں۔ نفس مضمون سے لگتا تھا کہ یہ تحریریں مجھے بتانے اور سمجھانے کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور ان میں میرے بہت سے ان پوچھے سوالوں کے جواب موجود ہیں۔ لیکن ان پرچیوں کے اچانک اور یکایک ہونے کی بنا پر اندازہ ہوتا تھا کہ استاد مکرم کے نوٹس ہیں جو انہوں نے اپنی تقریروں میں استعمال کرنے کے لیے جمع کئے ہیں۔

اس عرصے میں دو تھانیدار تبدیل ہو گئے اور تیسرا آ گیا جو ہیڈ کانسٹیبل سے ایس ایچ او

ہوا تھا۔ اس کا رویہ پہلے دو تھانیداروں سے مختلف تھا اور اس کا لب و لہجہ بھی کچھ عجیب سا تھا۔ اس نے اپنی گفتگو سے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ بھائی بابلی گرنتھی کو میں نے چھپا رکھا ہے اور میں ہی اس کی "ناواپسی" کا ذمہ دار ہوں۔

پولیس کا کاروبار بھی عجیب ہے۔ اس میں ایک مرتبہ جب کوئی شے مسل کے اندر داخل ہو جاتی ہے تو پھر اس کا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عدالت اپنا فیصلہ دے دے۔ سارے معاملے کی اصل حقیقت سمجھ کر اس کو نپٹا دے۔ معاملہ داخل دفتر ہو جائے۔ اس کی کوئی قانونی' معاشرتی' اخلاقی اور منطقی وجہ زندگی نہ رہے پھر بھی پولیس والے اس کو اپنی مرضی سے دوبارہ نکال کر اس پر تفتیش شروع کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں جان تو نہیں ہوتی نہ ہی اب اس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہوتا ہے لیکن پولیس والے اس میں جھوٹی جان ڈال کر اور اس نیولے کو کپڑے میں لپیٹ کر اس ڈسے ہوئے شخص کو پھر سے ڈرانے آ جاتے ہیں جو ایک مرتبہ کالے کے کاٹے کا شکار ہوا تھا۔ اب کی بار وہ مظلوم کے حامی بن کر ایک جھوٹے نیولے کو محافظ بنا کر ساتھ لے آتے ہیں کہ اس کے دودھ پانی کا بندوبست کر دیجئے پھر وہ کالا عمر بھر آپ کے نزدیک نہیں آئے گا۔

میں اپنے کیس میں بُری طرح زچ ہونے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ محکمہ پولیس کے کارندے دراصل اس پیشے کے اہل نہیں ہوتے اور ان کو زبردستی اس کام پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ چلمیں بھرنے' بھینسیں چرانے' گڑھا کھودنے' رسی بٹنے' گھوڑا نہلانے اور گزرتی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر ٹپے گانے کے لیے بنے ہوتے ہیں ان کو شرلاک ہومز کے باریک کام پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ اب وہ بیچارے کیا کریں اور کس طرح سے یہ ذمہ داری نبھائیں' اور کس کو بتائیں کہ یہ کام ان کے کرنے کا نہیں۔ انہیں زبردستی اس میں پھنسا دیا گیا ہے۔ جب ان کی فریاد اور نالہ و شیون کو کوئی نہیں سنتا وہ راہ چلتے لوگوں کو "زور زبردستی" پھنسانے لگتے ہیں اور اپنا غم غلط کرتے ہیں..... دراصل ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا وہ اس کام کے لیے بنے نہیں ہوتے اس مخصوص فنی پیشے کے لیے "کٹ آؤٹ" نہیں ہوتے۔

# ۲۴

میں نے بہت کوشش کی۔ بڑا سر مارا۔ ہر ممکن طریق سے ڈھونڈا۔ دور دور سے
معلومات حاصل کیں لیکن استاد گرامی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ یوں بھی جب وقت کے بہت
سارے اوراق ایک ساتھ الٹ جائیں تو پچھلے باب آپ سے آپ دب جاتے ہیں اور نئے
نقشے اور نئی مورتیں سامنے آجاتی ہیں۔

ایک ایک دن کر کے تین سال کا عرصہ گزر گیا اور ہمارے درمیان موت کی دراز قد
محبوبہ کو لیے اٹھا کر لیٹ گئی۔ زندگی کے اندر وہ جو ایک کھٹ مارنے اور سپرنٹ مارنے کا پڑ
تھا وہ ختم ہو گیا۔ وہ جو گرمیوں کے اندر ایک کم قیمت موم بتی کچھ اپنی گرمی سے کچھ باہر کی
گرمی سے خمیدہ ہو جاتی ہے زندگی بھی ایسی ہی "بچپن کی غلط کاریوں" جیسی ہو گئی۔ اوپر سے
ٹھیک ٹھاک' سرخ و سفید تنومند۔ اندر سے ماٹھے ہی ماٹھے۔ جب زندگی کے سامنے کوئی بڑ
مقصد نہ ہو تو یہ ایک اولڈ سپنسٹر کی طرح صاف ستھری' دھلی دھلائی پاکیزہ سی بلی بن کر تخلی
گدی پر بیٹھی رہتی ہے۔ کوئی بلا اس کی بے مقصد پاکیزگی کی وجہ سے قریب نہیں آتا!

کچھ ایسی ہی زندگی تھی اور کچھ ایسا ہی کام تھا۔ بلکہ زندگی میں ڈائرکشن نہ ہونے کی وجہ
سے کام اور بڑھ گیا تھا اور مصروفیت کے انبار لگ گئے تھے۔ زندگی کے لان پر آوارہ گردو کے
رات کو گندے کام کر کر کے جگہ جگہ گند پھیلا گئے تھے۔ ایسے میں کیا ہو سکتا تھا۔

میں ایک جگہ سے اٹھا اور دوسری جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ وہ جگہ
بھی ویسی ہی شاداں و فرحاں تھی! اس کے ارد گرد بھی ویسا ہی گند تھا..... کتابوں میں لکھا تھ
کہ مشکل کے وقت سکاوٹ مسکراتا اور سیٹی بجاتا ہے۔ میں نے مسکرا کر سیٹی بجانے کی
کوشش کی تو پھونک دانتوں کے اندر سے نکل گئی۔ سیٹی نہ بج سکی۔ جب سیٹی نہ بجی تو میں
شرمندہ ہو کر مسکرانے لگا۔

OCIETY.COM

ایک روز اخبار میں خبر دیکھی کہ حیدر آباد اور کراچی کے درمیان نیشنل ہائی وے پر کراچی سے پشاور جاتے ہوئے ایک آئیل ٹرک نے حیدر آباد سے کراچی آتی ہوئی ایک فوکسی کو ٹکر مار دی۔ یہ ٹکر تو کچھ ایسی شدید نہیں تھی لیکن اس نے فوکسی کا رخ پھر حیدر آباد کی طرف موڑ دیا۔ اندر بیٹھی ہوئی سواریوں کو خراش تک نہ آئی۔ موٹر کا کوئی نقصان نہ ہوا اور گاڑی اس طرح سے چلتی رہی مگر الٹی سمت کو۔

البتہ اس ٹکر سے فوکسی کو آگ لگ گئی اور وہ دیکھتے دیکھتے نارنجی شعلوں کا ایک ایسا مینار بن گئی جس کی چوٹی پر کالا سیاہ دھواں گھٹا ٹوپ اندھیرا بن کر آسمان سے واصل ہو گیا۔ فوکسی کے دونوں دروازے جام ہو گئے اور اس کے اندر بیٹھی ہوئی سواریاں چیخنے چلانے اور تڑپنے لگیں۔ دونوں طرف کا ٹریفک رک گیا۔

کراچی سے آتے ہوئے ایک تاجر نے اپنی مرسڈیز کی پچھلی سیٹ سے دیکھا' فوکسی کے اندر ایک دراز قد' خوبصورت لڑکی دونوں ہاتھ باندھ کر باہر کھڑی پبلک سے التجا کر رہی تھی اور لوگ سہمے کھڑے تھے۔ وہ کبھی دونوں بندھے ہاتھ اس شیشے کے لوگوں کی طرف لہراتی' کبھی دوسرے شیشے کی جانب لیکن کسی میں بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

سیٹھ اپنی مرسڈیز کا دروازہ کھول کر بجلی کی طرح لپکا اور فوکسی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہینڈل کو گرم پا کر اس نے جلدی سے رومال نکالا اور ہاتھ پر لپیٹ کر ہینڈل پر زور لگانے لگا۔ دروازہ نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ سیٹھ کے براؤن کوٹ کے لیبل کو آگ نے پکڑا تو اس نے سینے پر ہاتھ مار مار کر آگ کا لا بند منا دیا۔ گاڑی کے پیچھے سے ہو کر وہ دوسرے دروازے پر پہنچا تو اس کا ہینڈل زیادہ گرم اور زیادہ مضبوطی سے بند تھا۔ اس نے بیتابی کے عالم میں ہینڈل کو زور زور کے جھٹکے دیئے اور ہینڈل اور جام ہو گیا۔

سیٹھ کے کوٹ کے گھیر کو آگ نے پکڑ لیا۔ اس کے سر کے بال راکھ ہو کر گر گئے۔ اس نے ناامیدی اور نامرادی کے عالم میں ہینڈل کو اس زور سے دھلایا کہ گاڑی کی پوری سائیڈ اوپر اٹھنے اور نیچے گرنے لگی۔ اپنی سدھ بدھ کھو کر اور مکمل طور پر بے اختیار ہو کر اس نے اپنا ماتھا جلتی ہوئی فوکسی کی چھت سے ٹکرانا شروع کر دیا اور دیوانگی کے عالم میں اپنا سر اس زور سے بجایا جیسے مست ملنگ درگاہ کی سلوں سے اپنا سر ٹکرایا کرتے ہیں۔

اچانک دوسری طرف کا دروازہ کھل گیا اور فوکسی کے تینوں مسافر چیخیں مارتے باہر نکل آئے۔ سیٹھ نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی اور اس کا وجود جلتی ہوئی گاڑی کے ساتھ چمٹ کر رہ

گیا۔ مرد عورتیں اونچی اونچی آوازیں رونے اور بین کرنے لگے۔ سیٹھ کا جلتا ہوا وجود پہلے برہنہ ہوا۔ پھر لال انگارہ' پھر کالا سیاہ اور پھر پھول کر گاڑی کے ساتھ ایک کھمبا سا بن گیا۔

بڑی دیر بعد فائر بریگیڈ پہنچا اور گاڑی پھٹنے سے بچالی گئی۔ چمٹے ہوئے سیٹھ کی لوتھ کو بڑی مشکل سے اور بڑی بیدردی سے گاڑی سے الگ کیا گیا اور اسے اس کی مرسڈیز میں ڈال کر گھر واپس بھیج دیا گیا۔

یہ تفصیل جو میں نے ابھی بیان کی اگلے دن کے اخبار میں پوری جزئیات کے ساتھ چھپی تھی اور اس میں شوقین مزاج سیٹھ کی بدمعاشی کے ساتھ مسکراتی ہوئی تصویر تھی.....

سیٹھ میرا پیارا دلبر جانی بابا سنگل شاہ تھا جو بعد میں گجرات کچہری کا وثیقہ نویس بنا اور پھر ایکسپورٹ کا تاجر بن کر جرمنی اور ہالینڈ رودہ بھیجنے لگا۔ اب وہ اپنی تجارت کو مزید وسعت دینے کے لیے بہاولپور اور ملتان جارہا تھا اور راستے کے مذبح خانوں کی تفصیلات بہم کررہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اگر وہ ان مذبح خانوں سے رابطہ کر کے اور اپنے ایجنٹ وہاں بٹھا کر بلاواسطہ طور پر رودہ حاصل کرنے لگے گا تو ایک تو اسے مال بھی بہت سستا پڑے گا۔ دوسرے رودے کی وافر سپلائی سے وہ ہالینڈ کی مارکیٹ بھی اپنی گرفت میں لے لے گا۔ لیکن ہالینڈ کی منڈی کو گرفت میں لینے سے پہلے وہ خود لاٹ کی لپیٹ میں آگیا۔

OCIETY.COM

# ۲۵

یہ کیوں ہے؟ اور ایسا کس لیے ہوتا ہے اور اس کا کون ذمہ دار ہے۔ میں نے پورے دھرم' ایمان اور علم گیان کے ساتھ اس پر سوچا۔ کافر' مشرک اور ناستک ہو کر اس پر غور کیا۔ تشکیک کے کھلے میدانوں میں عقل اور منطق کے گھوڑے دوڑائے۔ نہ کوئی آگے نکل سکا نہ پیچھے رہا۔ پھر فلسفہ اور نفسیات کا سہارا پکڑا۔ اس نے بہت ساری گتھیاں سلجھائیں لیکن سلجھانے کے بعد ایک ایسے مقام پر لے جا کر چھوڑ دیا کہ واپسی کے سارے راستے گم ہو گئے۔ بڑی دیر تک فرائیڈ اور مارکس کا مطالعہ کیا۔ ان کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ استادوں سے مدد لی لیکن اخیر پر پہنچ کر یہی معلوم ہوا کہ دونوں ہی ایک محلے کے اندھے فقیر تھے۔ ایک زن کی صدا لگاتا تھا دوسرا اَن کی۔ لیکن کسی سے کچھ دان دکھشانہ مل سکی۔ جیسے خالی ہاتھ آئے تھے ویسے ہی خالی جھولی لے کر واپس چلے گئے۔ زندگی کا کوئی بھید نہ کھلا۔

ایک چیونٹی لالو کھیت سے چلتی چلتی کلفٹن کے ساحل پر پہنچی۔ لڑکی پائنچے چڑھائے سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہروں میں بھاگی پھرتی تھی۔ لڑکے نے ریت پر دری بچھاتے ہوئے اور کھانے کی اشیاء چاروں کناروں پر سجاتے ہوئے غور سے نیچے کی طرف دیکھا تو چیونٹی ریت کے ایک موٹے سے ذرّے کو پرے دھکیل کر دری پر چڑھ رہی تھی۔ لڑکا اسے اتنی دور سے ایسے نامانوس ماحول میں دیکھ کر حیران ہوا اور پھر ہنس کر بولا "بواُ ادھر کدھر پہنچ گئی!"

چیونٹی نے ہانپتے ہوئے کہا "میاں لالو کھیت سے یہاں تک کا سفر بارہ دن میں طے کر مشکل سے سمندر کنارے پہنچی ہوں اور اب بھوک سے نڈھال ہوں۔"

لڑکے نے کہا "حیرت ہے آپ کی عقل پر! یہاں آپ کی پسند کا دانہ دنکا کہاں' یہ تو سمندر ہے۔ یہاں یا تو ریت ہے یا پھر پانی!! آپ نے بھوکوں تو مرنا ہی تھا۔"

چیونٹی نے کہا "میاں ایک زمانے کی خلش دل میں پوشیدہ تھی کہ سمندر کو دیکھوں۔

WWW.PAKS

اس کو سمجھوں اور اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کروں۔ سو یہاں آ گئی ہوں۔ اب ا
وسعت کا' اس کی گیرائی کا اور اس کی گہرائی کا خود اندازہ لگاؤں گی اور واپس جا کر اپنی
تفصیل سے بتاؤں گی کہ سمندر اصل میں ہوتا کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟"

اسی طرح انسان زندگی کے بارے میں ناک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے۔ کبھی نظم' میں
نثر' میں کبھی ریاضی کے معاملات میں۔ کبھی زمینی دوربین سے کبھی آسمانی ہبل سے۔
مفروضوں کے زور پر کبھی ایمان و اعتقاد کے سہاروں سے لٹک کر۔ لیکن بھید کھلتا نہیں
کہ فرمادیا گیا ہے کہ ہاں تم کو علم دیا گیا ہے الا قلیلا!

میرے صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شفائی یہ زندگی کچھ نہیں بس ایسے ہی کھیل
ہے۔ اس کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ بس اس کے اندر سے گزر جانا چاہیے۔ ہنستے
گاتے بجاتے' رجز پڑھتے' حدی خوانی کرتے' نعرے مارتے' آنسو بہاتے' ناکام ہوتے'
مناتے' صلیب اٹھا کر سولی چڑھتے' سولی سے اتر کر بھاگ کھیلتے' لنگوٹی اتار کر دھوپ
کھڑے ہوتے' دھوپ سے نکل کر سیلاب میں ڈوبتے' ڈوب جاتے تو پھر ابھرتے' ابھر
تو لوگ پکڑ لیتے..... یہ تو لمبا کھیل تماشا ہے' جیسے بچے سوئی کے گھوڑے پر سوار ہو کر گلی
دس دس چکر لگا لیتے ہیں اور ان کا جی نہیں بھرتا۔ منزل آ بھی جاتی ہے پھر بھی گھوڑا بھ
پھرتے ہیں۔

میرے مرشد' میرے استاد' میرے گرو بھائی اقبال سنگھ گرنتھی پتہ نہیں اب
تھے۔ ان کا ٹھیک ٹھور ٹھکانہ معلوم نہیں تھا لیکن اندر کے بھیدی جانتے تھے کہ وہ آ
طرف نکل گئے تھے اور ناگالینڈ کے لوگوں کے ساتھ نیا تعلق پیدا کر لیا تھا۔

جو لوگ ان سے مل کر آئے تھے انہوں نے بتایا کہ گوہاٹی کے چھوٹے گوردوار
میانی میں رہتے ہیں۔ شبد کیرتن کرنے کے بعد اپنے آپ کو اس میانی میں بند کر لیتے ہ
کسی سے ملتے نہیں۔ بھائی بدھ سنگھ سیوادار کو حکم ہے کہ اگر علاقے کا گورنر بھی ملنے کے
آئے تو اس کو انکار کر دیا جائے۔

جن لوگوں نے شبد کیرتن کے بعد ان سے بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں
ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جواب دینے سے منع کر دیا۔ سب یہی کہتے تھے کہ انہوں نے دیکھا
ہے۔ سنا ضرور ہے پر بھائی بابلی سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ مسکرا کر کندھے پر
ضرور دھرتے ہیں لیکن کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ اور اگر گوہاٹی گوردوارے سے

OCIETY.COM

والے ایک سے زیادہ ہوں تو پھر جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور وہ آپس میں بحث کرتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ ان کو یقین تھا کہ وہ گرنتھی بھائی باہلی ہی تھے۔ اگر وہی تھے تو پھر انہوں نے اپنا پاپا کیوں بدل لیا ہے۔ اگر بدل ہی لیا ہے تو وہ پنجاب سے آنے والوں کی سکھ سانڈ کیوں نہیں لیتے۔ کیا وہ سچ مچ ہیں یا پردہ کر گئے ہیں اور ان کی آتما گرنتھی کے روپ میں آکر شبد کیرتن کر جاتی ہے اگر وہ آتما نہیں ہے جو گوردوارے کی میانی میں رہتی ہے تو اس نے آج تک بھائی بدھ سنگھ سیوادار سے کوئی کھانے پینے کی چیز کیوں نہیں مانگی۔

جھگڑا کرنے والے پوچھتے ہیں کہ اگر وہ صرف آتما ہیں اور آتما کسی سے کوئی بات نہیں کرتی تو انہوں نے ملوٹ کی کرپو درزن سے یہ کیوں پوچھا کہ "تخت پور کی رجنی کیسی ہے؟ اور کرپو کا جواب ملنے پر کہ رجنی تو سودائی ہو کر گھر سے نکل گئی ہے اور اب شمشان بھومی میں رہتی ہے' تو بھائی باہلی نے ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کیوں کہا تھا کہ "بس کرپو پر سنسار تو کھیل تماشا ہے اور اکالی پرکھ کی لیلا اس سے آگے کچھ نہیں!"

پر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسے کھیل تماشا نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں یہ دنیا ایک حرکی قوت ہے اور اس کے آثار سائنس کے طے شدہ اصولوں کے مطابق رونما ہیں۔ یہ کھیل تماشا کدھر سے ہو گیا! مذہبی لوگ ایسے ہی یاوہ گوئی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا بُرا ہو۔ یہ دفع بھی نہیں ہوتے ساتھ ساتھ چلے آتے ہیں۔

ایک کوئی بڑا گیانی تھا۔ گورا گیانی۔ وہ کہا کرتا تھا "بھائی یہ دنیا تو ایک سادہ اور صاف تختی ہے اور میرا یقین ہے کہ زندگی کے کوئی معنی نہیں۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔ بس ایک موجود خلا اور باحقیقت خلا ہے جس کو ہم انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر اپنے ذخیرہ الفاظ سے بھرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور ایک مقام ایسا آتا ہے جب بڑا سوچا سمجھا' جانا پہچانا' اور چھانا پھٹکا ذخیرہ الفاظ ایک ہذیان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بک بک جھک جھک اور بسیار گوئی کی ایک لمبی لڑی بن جاتا ہے۔ سارے سیانے بیانے دانشمند' اور نیک بناد دانشور سینہ سینہ مارنے لگتے ہیں اور بے شمار لفظوں کی دھونکنیاں چلا کر ہانپنے لگتے ہیں' اور باحقیقت خلا اور باحقیقت ہو جاتا ہے!

میرا یار ملک التجار' سنگل شاہ' عیش پسند اور عیش کوش' عبادت کے نوکیلے کیلوں والے پھٹے پر بیٹھا اس دنیا کے مزے لے رہا تھا اور چٹخارے بھر رہا تھا۔ اس کو کیا ہوا۔ یا اس نے کیا کیا کہ اپنی خوبصورت سی' تھری پیس کی ملبوس زندگی جلتی چتا کے حوالے کر دی اور

موٹر کے ہینڈل سے ہاتھ نہ چھڑوا سکا۔ اور جن کو مر جانا چاہئے تھا جو موت کے گولے کے اندر بند تھے اور موت کے پنجرے میں محبوس تھے اور دوسرا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ اگر ہم ایک دنیا بنائیں تو کیا وہ موجودہ دنیا سے بہتر نہ ہو۔ اس میں خطرے کے وقت پہلے تو گھنٹی بجا کرے۔ پھر حفاظتی دروازے خود بخود کھل جایا کریں۔ سیڑھیاں آپ سے آپ لگ جائیں۔ ہنڈوے کنوئیں کو ٹنڈوں کی طرح اوپر جائیں اور لوگوں کے ڈھیر اٹھا اٹھا کر نیچے اتر آئیں۔ کوئی حفاظت تو ہو' سکیورٹی تو ہو۔ اب تو زندگی ایسے ہی کھڑی ہے۔ الف ننگی۔ کسی کو کچھ دیتی ہی نہیں۔ دے ہی نہیں سکتی۔ اس کے اختیار میں ہی کچھ نہیں۔ اس سے تو انشورنس کمپنی اچھی ہے۔ ایک سکیورٹی تو ہے۔ بندا چاہے رہے نہ رہے لیکن اس کی سکیورٹی تو باقی رہ جاتی ہے۔ جیسے مرنے والے کے بعد اس کی ٹوپی' صدری' سوئی اور جوتی باقی رہ جاتی ہے۔

لیکن جانے والا رک رک کر اور مقابلہ کر کے جا رہا ہے۔ جیسے جانور مرنے سے پہلے موت کا بھرپور انداز میں مقابلہ کرتا ہے۔ وہ موت کو روک کر مقابلہ کرتا ہے۔ موت کے روکنے پر پورا زور لگاتا ہے اور زندگی کے لیے لڑتا ہے۔ ایک ڈڈو آدھے سے زیادہ سانپ کے منہ میں جا کر پورا زور لگاتا ہے اور اپنے پچھلے پنجوں کی کھدیڑ سے بار بار سانپ کے منہ سے باہر نکل آتا ہے۔ باہر نکل کر وہ کھسک جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن سانپ اسے پھر پکڑ کر اپنے منہ میں فٹ کر لیتا ہے۔ اس دھینگا مشتی' چھینا جھپٹی' اور بچن بچاؤ کے بعد سانپ بالآخر ہمت کر کے اسے منہ میں ڈال کر اندر اتار لیتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ میں نے جانوروں کو لڑتے دیکھا ہے انسان کو لڑتے دیکھا ہے۔ اور ایسے میں لڑتے دیکھا ہے جب حالات ان کے مخالف تھے اور وہ دشمن کے ساتھ مل گئے تھے۔ ان کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اگر بچ گئے تو چمڑی اتر جائے گی لیکن وہ لڑتے تھے اور زندہ رہنے کے لیے موت کے آخری کنارے تک لڑتے تھے۔ شاید ہم کسی خاص شے کے لیے یا کسی خاص آدرش کے لیے نہیں لڑتے بس ایسے ہی لڑتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے اور زندگی سے پیار کرنے کے لیے اور زندگی کو پیاری بناتے رہنے کے لیے۔ لیکن پتہ نہیں اصل راز کیا ہے اور میں جو یہ بکواس کر رہا ہوں تو میں اس پر کوئی اتھارٹی نہیں ہوں۔ مجھے تو سنگل شاہ کی وجہ سے یہ سب باتیں سوجھ رہی ہیں ورنہ میرا ان چیزوں سے بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔

میں تو اس کھیل تماشے میں زندگی کے تضاد سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ زندگی

OCIETY.COM

کی عقلی اور غیر عقلی ثنائی تقسیم سے۔ اس کی دورنگی ہے' اس کے تناقض سے۔ صبح سے شام تک اور ازل سے ابد تک زندگی تناقض کی پٹڑی پر ہی چلتی ہے اور اپنی دی ہوئی مضبوط اور قابل عمل دلیل کو خود ہی کاٹتی چلی جاتی ہے۔ زندگی کا یہی کھیل سب سے بڑا تماشا ہے۔ اور اسی تماشے کو دیکھنے کے لیے زندگی کے نمائندے دور دور سے آتے ہیں۔

میرٹھ میں کوئی آدمی تھا۔ بہت ہی غریب اور مفلوک الحال۔ باقاعدہ بھکاری تو نہیں تھا لیکن اس کی گزراوقات کا دارومدار مانگنے پر تھا۔ سکہ بند فقیر نہیں تھا بس ایک معمولی سا منگتا تھا۔ ایک روز اس کنگلے کو نہر کنارے پٹڑی پر ایک تھیلی ملی جس کے اندر بارہ سو روپے اور پانچ طلائی اشرفیاں تھیں۔ اس نے اس خزانے کو جھولی میں انڈیل کر پانچ مرتبہ گنا اور پھر یہ تھیلی کچہری لے جاکر مجسٹریٹ کے پاس جمع کرادی کہ جس کی ہو نشانی بتا کر لے جائے اور فقیر کے حق میں دعا کرے۔

اسی میرٹھ کے اندر ایک مرد کہن سال' سرد و گرم کشیدہ گرگ باراں دیدہ سیشن جج کی عدالت میں پیش ہوا جس نے ایک پانچ سالہ بچی کے کانوں سے سونے کی بالیاں نوچ کر اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا اور معصوم کی لاش اس نہر کے اندر پھینک دی تھی۔ سیشن جج کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بالیاں سات سو میں بکی تھیں اور سنار نے سو روپے اس بنا پر کاٹ لیے تھے کہ مال چوری کا معلوم ہوتا ہے!

سیشن جج نے آہ بھر کر کہا "اے ظالم اور سفاک قاتل آج سے چند سال پہلے جب میں اس شہر میں مجسٹریٹ تھا تو ایک مرد درویش اس نہر کے کنارے سے بارہ سو روپے کی تھیلی مع پانچ عدد طلائی اشرفیوں کے میری عدالت میں جمع کرا گیا تھا کہ جس کی ہو آکر لے جائے اور ایک تو ہے کہ تو نے چند ٹکوں کی خاطر خون ناحق سے ہاتھ رنگے اور معصوم بچی کے والدین کو عمر بھر کے لیے روتا بلکتا چھوڑ دیا۔ مجھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے اس گھناؤنے جرم کے لیے کیا سزا دوں کہ لوگوں کو عبرت ہو اور معصومہ کے گھر والوں کو قرار آئے۔"

مجرم نے ہاتھ باندھ کر کہا "جج صاحب میں وہی شخص ہوں جس نے نہر کنارے سے تھیلی اٹھا کر آپ کی عدالت میں جمع کرائی تھی اور کسی قسم کا انعام لینے سے انکاری ہو چکا تھا۔ مجھے پتہ نہیں جب کیا تھا اور اب کیا ہے۔ میں بھی وہی ہوں۔ شہر بھی وہی ہے۔ نہر بھی اسی طرح سے چل رہی ہے لیکن یہ واقعہ گزر گیا ہے اور اس پر میرا کوئی کنٹرول نہیں رہا!

یا تو زندگی کے کچھ معانی ہیں یا بالکل نہیں ہیں۔ یا پھر تم خود زندگی کو معانی عطا کرتے

ہو۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے۔ یا تو تم کو اس بات کا احساس ہے کہ تم یہاں کس لیے ٹھہرے ہوئے ہو' اور تم حالات و واقعات کا رخ اس طرف پھیرتے رہتے ہو یا پھر یہ سب کچھ ایسے ہی ہے اور کسی کو کوئی رخ معلوم نہیں۔

ایک مرتبہ ہم نے بابا مردان شاہ سے پوچھا "باباجی یہ زندگی ہے کیا؟" تو انہوں نے گھور کر ہماری طرف دیکھا۔ پھر مسکرائے اور تالی بجا کر چوگوشیہ ٹوپی سر سے اتار کر پرے پھینکی' سنجیدگی سے بولے "یہ زندگی ایک سمندر ہے۔ اور ہم اس سمندر کے بیچوں بیچ اونچی لہروں پر گھوم رہے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں ہیں اور سمندر کا رخ کدھر کا ہے۔ اگر سطح آب پر نشان منزل ہوتے تو ہم بتا دیتے کہ ہم کہاں ہیں۔ لہروں پر سنگ میل ہوتے تو ہمیں اپنے مقام کا پتہ چل جاتا۔ لیکن ہم پھر بھی بڑی ڈھٹائی سے خدا کو تلاش کر رہے ہیں' اور ابد تک کرتے رہیں گے کیونکہ تلاش ہی ہماری منزل ہے۔"

خوش ہو کر بولے "انسان جب اپنا مقصود حاصل کر لیتا ہے تو اس کو روحانی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ آنند کی گود میں اتر جاتا ہے۔ لیکن جس طرح ایک گونگا کڑاہی گوشت کا ذائقہ نہیں بتلا سکتا اسی طرح ہم بھی نہیں سمجھا سکتے کہ روحانی سعادت کیا ہوتی ہے اور نروان کا تانا بانا کیسا ہوتا ہے!"

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ زندگی ایک طرف گھومتی گھومتی بالکل الٹ کیسے گھومنے لگتی ہے۔ وہ کونسا عمل ہے جو اس کا رخ دوسری طرف پھیر دیتا ہے اور وہ کونسی پھرت ہے جو پھرتے پھرتے اس میں دوسری جانب کا عمل پیدا کر دیتی ہے کیوں؟ کس لیے؟ کیسے؟

جب ہمارے یہاں کپڑے دھونے کی ولائتی مشین آئی تو ہمارے تایا صاحب نے پہلے تو اس کے قریب کھڑے ہو کر سورۃ مومنون پڑھی (وہ صبح سویرے اس کا ورد کیا کرتے تھے) اور پھر مشین کے دونوں کناروں پر ہاتھ رکھ کر اس سے بیعت کر لی اور اونچی آواز میں پکار کر میری والدہ سے کہا "بی بی! زندگی کا راز معلوم ہو گیا اور اس کا بھید تمہاری اس کپڑے دھونے والی مشین نے کھولا کہ پہلے تو چکر سیدھے ہاتھ چلتا ہے اور گھڑی کی سوئیوں ہار گھومتا ہے پھر خود ہی الٹ جاتا ہے اور برعکس گھومنے لگتا ہے۔ نہ کسی نے کہا ہوتا ہے نہ سمجھایا ہوتا ہے نہ کوئی بٹن دبایا ہوتا ہے۔ بس یہ اس کی مرضی ہے کچھ زندگی کی کچھ زندگی کے مالک کی۔ ہم بے دخل لوگ ہیں۔ ہمارا کوئی عمل دخل نہیں۔"

مگر یہ سنگل شاہ نے کیا کیا۔ جس طرح ایک وزنی لکڑی نہر کے پانی پر تیرتے ہوئے

OCIETY.COM

ڈبکیاں کھاتی ہے کہ اب ڈوبی پھر نکلی پھر غرق ہوئی پھر باہر نکل آئی۔ سیدھی سپاٹ تیرتی رہی پھر غوطہ کھا گئی ایسے ہی سنگل شاہ نے کیا۔ کہاں سے ابھرا۔ کدھر کو ڈوبا پھر کیسے نکلا پھر کیونکہ غرق ہوا۔ نیچے ہی نیچے چلتا چلتا کس کنارے پر جا لگا۔ نہ اس کا کوئی اور معلوم نہ ٹھور۔ وہاں سے لوٹا تو ایک گرداب میں گھومنے لگا۔ گرداب سے بچا تو جل دھارا سمیت جوالا مکھی میں جا گرا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے! کیا کسی کے پاس کوئی ایسی کتاب ہے جس میں زندگی کے رموز ترتیب سے لکھے ہوں۔ جیسے فزکس کی کتاب میں باریک باریک مشاہدات ایکوشن کے دھاگوں سے باندھ کر لٹکا دیے جاتے ہیں۔ جیسے عورتیں سردیوں میں شلجم سکھانے کے لیے انہیں ڈوریوں میں پرو کر لٹکا دیتی ہیں۔ پتنگ اڑتے اڑتے جھپ کیوں کھا جاتی ہے۔ پتنگ باز استاد لوگ اس کی وجہ جانتے ہیں۔ وہ پتنگ نیچے اتار کر ایک چیپی تھوک سے ادھر لگا دیتے ہیں۔ ایک چٹکی پتنگ کے لنگوٹ سے نوچ کر پرے پھینک دیتے ہیں۔ پھر کنکوا الٹا کر کہتے ہیں "جاؤ اڑاؤ۔ سیدھا اڑے گا۔"

گلائیڈر کے استاد ساتھ بیٹھے شاگرد کو بتا دیتے ہیں کہ جہاز کو ٹیڑھ سے بچانے کے لیے اسے بائیں ہاتھ کی کرنٹ میں ڈال دو۔ پھر دونوں فلیپر پورے دبا دو۔ ناک کی سیدھ اوپر کو اٹھے گا اور کنی نہیں کاٹے گا۔

لیکن زندگی کو سیدھ میں رکھنے کے لیے کوئی فارمولا نہیں۔ امریکی لوگ اس قسم کی بہت سے کتابیں چھاپا کرتے ہیں: دوست بنانے کے گر' باس کے ساتھ مفاہمت' لڑکی پھنسانے کے طریقے' ازدواجی زندگی سے عہدہ برا ہونے کے راز' حق مہر ادا کیے بغیر طلاق لینے کا طریقہ' لوگوں پر اثر انداز ہونے کے سات راستے...... یہ اور اس طرح کی بے شمار ہر ہفتے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن زندگی پر حاوی ہونے اور حیات انسانی کے طیارے کا صحیح ٹیک آف کر کے سیف لینڈنگ کرنے کے کوئی اصول کسی بھی کتاب میں موجود نہیں۔

روس والوں نے ایک سیدھا سا راستہ بتایا تھا اور وہ دل کو بھی لگا تھا کہ زندگی کا جدلیاتی مادہ اعظم نکال کر اسے نوع انسانی پر بقدر طلب ڈال دیا جائے تو زندگی پورے طور پر کنٹرول میں آ جاتی ہے۔ جس طرح منہ زور گھوڑا کانٹے دار دہانہ دانتوں میں دبا کر سوار کے اشاروں پر گھومتا ہے اس طرح جدلیاتی اقدار کو اپنا کر زندگی کا ہر مسئلہ آسانی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔

WWW.PAKS

اگر روس کچھ دیر اور زندہ رہتا اور اس کے فلسفے کو انسانوں کی تائید مل جاتی اور جیتے جاگتے لوگ اس کے علم الکلام کا ٹھمنا بن جاتے تو کرۂ ارض کے رہنے والوں کی تقدیر بدل جاتی مگر افسوس روسی ناقہ کی کونچیں کاٹ کر اسے چشمہ حیواں پر اوندھے منہ گرا دیا گیا۔ اس کی کھلی آنکھوں والے بے حس و حرکت چہرے کے نیچے ٹھنڈے میٹھے جدلیاتی چشمے کا پانی گرگلا رہا تھا اور چھوٹی چھوٹی گھومن گھیریاں ڈال رہا تھا۔

قلندر صاحب نے کہا "یہ بھی ایک سنت ہے۔ ہمیں راہ کراہ چلنا پڑتا ہے اور مجرموں کا ساعذر کرنا پڑتا ہے۔ فرمانے والا فرماتا ہے کہ کبھی ہمیں قاب قوسین کی مسند پر بٹھاتے ہیں اور کبھی ابوجہل کے دروازے پر بھیجتے ہیں۔ کبھی ہمیں "شاہد اور منیر" کا لقب عطا کرتے ہیں اور کبھی جادوگر اور سودائی کہلواتے ہیں۔ کبھی جبرئیل کو ہماری رکاب داری کے لیے بھیجتے ہیں اور کبھی بغیر عہد نامے کے ہمیں مکے میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ کبھی آسمانی خزانے ہمارے حجرے میں لا رکھتے ہیں اور کبھی ایک جو کی خاطر ابو شحمہ کے دروازے پر بھیجتے ہیں۔ کبھی ہمارے نوکروں سے کسی کے ہاتھ سے چیز کھلواتے ہیں اور کبھی ہمارے دانت نا ایمان والوں کے ہاتھ سے تڑواتے ہیں۔ اور یہ اس لیے ہے کہ جہان والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہماری راہ بہت مصیبتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اگر تجھ کو اس راہ کا خیال ہے تو سر کو پاؤں بنالے اور سر کے بل سارا سفر طے کر نہیں تو اس راہ سے الگ ہو کر بیٹھ جا اس واسطے کہ یہ راہ معمولی پاؤں سے طے نہیں ہوتی!

میرا خیال ہے میرے دوست سنگل شاہ نے بھی یہ راہ معمولی پاؤں سے طے کرنے کی کوشش کی تھی اور زخم کھا کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

OCIETY.COM

# ۲۶

اس واقعہ کو گزرے پورے پانچ سال ہو چکے تھے۔ اس سے ایک ڈیڑھ برس پہلے میں اپنے استاد' مرشد اور گرو سے آخری مرتبہ ملا تھا اور پھر ان کے درشن نہیں ہوئے تھے۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ گوہاٹی کے گوردوارے میں رہتے ہیں اور ان تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ ایک تو وہ کسی سے ملتے نہیں اور کسی سے بات نہیں کرتے۔ دوسرے ایک پاکستانی کا آسام جانا اور وہاں چند روز قیام کرنا ایک مشکوک سی بات ہے۔

لیکن اب کی بار میں نے بیساکھی کے میلے پر آئے ہوئے نامانوس سکھ یاتریوں کو دیکھ کر فیصلہ کر لیا کہ میں بھائی اقبال سنگھ باجلی سے ملنے ضرور جاؤں گا اور جتنے روز کا ویزا ملا' سارا وقت ان کے چرنوں میں گزار کر آؤں گا۔

انڈیا کا ویزا تو مل رہا تھا مگر گوہاٹی جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ کسی نے مجھے بتایا کہ اگر عبدالغفار خان کے گھرانے سے رابطہ کر کے ان سے حکومت ہندوستان کے نام ایک رقعہ حاصل کیا جائے تو انڈین گورنمنٹ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ رقعہ بردار کو نہ صرف وہاں جانے کی اجازت مل جائے گی بلکہ اس کے ساتھ شاہی مہمان کا سا سلوک کیا جائے گا۔

میں لاہور سے باچا خان کے گھرانے کو سفارشی فون کرا کے اور یہاں سے ان کے نام ایک پرزور تعارفی خط لے کر پہلے پشاور پہنچا تا کہ پشتو اکیڈمی کے ایک کارندے کو ساتھ لے کر چارسدہ حاضری دے سکوں۔ لیکن گل زمان ایک دن کی چھٹی پر تھا اور مجھے مجبوراً پشاور قیام کرنا پڑا۔

روس افغانستان کی لڑائی آخری دموں پر تھی اور پشاور افغانی مجاہدوں کی چھاؤنی بنا ہوا تھا۔ مقامی لوگ بہت تنگ تھے اور اپنے شہر کی ہر خرابی کا باعث افغان مجاہدین کو گردانتے تھے۔ جو سیاسی' معاشرتی اور حرکی طور پر تو مقامی لوگوں کی راہ میں حائل نہیں تھے البتہ

اقتصادی اور معاشی طور پر یہاں کی ہر منفعت سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے۔

شام کے وقت جب میں گرین ہوٹل سے باہر نکلا تو کسی نے مجھے میرا نام لے کر آواز دی۔ میں نے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا تو میری پہچان کا کوئی بھی نہ تھا۔ میں چلنے لگا تو پھر وہی آواز آئی۔ میں اپنی جگہ پر رک گیا اور گردن گھما کر کھڑا ہو گیا۔

ایک نوجوان میرے پاس آکر رکا۔ اس نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور مسکرانے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے ہلایا اور اس کے جواب میں بہت سی مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیری۔ وہ میرا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں!"

میں نے نفی میں سر ہلایا' تو اس نے کہا "میں طالوت خان ہوں اور پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔" میں نے کہا "آپ کا چہرہ تو کسی حد تک مانوس سا نظر آتا ہے لیکن آپ کا نام میرے ذہن میں کہیں بھی موجود نہیں۔"

کہنے لگا "چند سال پہلے میں آپ سے ملا تھا اور ہم نے دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا تھا۔ اس وقت آپ اتنے بھاری نہیں تھے۔

میں نے شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا "میری نوکری ہی ایسی ہے۔ سارا دن بیٹھے رہنا پڑتا ہے اور بیٹھ بیٹھ کر آدمی فربہ ہو جاتا ہے۔"

کہنے لگا "آپ کا وہ سکھ دوست کہاں گیا؟"

میں اس کی بات نہ سمجھ سکا اور الوؤں کی طرح اس کا منہ تکنے لگا۔

بولا "آپ کے اس سکھ دوست کو کیمرے کی تلاش تھی..... اور وہ....."

لیکن پیشتر اس کے کہ وہ فقرہ مکمل کرتا میں لپک کر اس سے بغلگیر ہو گیا۔ میں نے کہا "تم تو طالوت ہو طالوت خان۔ ہم سے حسن ابدال میں ملے تھے اور ہم نے اکٹھے کھانا کھایا تھا' پشاوری قہوہ اور ساتھ مچھلی اور پکوڑے!"

اس نے کہا "وہ سکھ اقبال سنگھ آپ کا مرشد تھا؟ باقاعدہ پیر بابا"

میں نے کہا "اس سے بھی زیادہ۔ وہ میرا سب کچھ تھا اور اس نے مجھے....."

"تو اب وہ کہاں ہے؟" طالوت نے مسکراتے ہوئے پوچھا "آپ کا سکھ پیر؟"

میں نے کہا "میں اسی کی تلاش میں انڈیا جا رہا ہوں اور یہاں سے سفارشی رقعہ لینے آیا ہوں..... میرا پیر بابا بھائی بالی گرنتھی ان دنوں گوہاٹی کے چھوٹے گوردوارے میں شبد

OCIETY.COM